راشد شاز

ایک نئی یونیورسٹی کا نظری منصوبہ

ایک نئی یونیورسٹی
کا
نظری منصوبہ

راشد شاز

ملّی پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۵

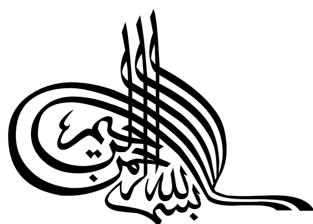
سالِ اشاعت ۲۰۱۲ء

ISBN 978-93-81461-09-9

نامِ کتاب : ایک نئی یونیورسٹی کا نظری منصوبہ
مصنف : راشد شاز
اشاعت اول : ۲۰۱۲ء
قیمت : پچیس روپئے (Rs.25/-)
مطبع : گلوریس پرنٹرس، نئی دہلی۔۲

ناشر
ملّی پبلی کیشنز
ملی ٹائمز بلڈنگ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Milli Times Building, Abul Fazl Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi-25
Tel:. +91-11-26945499, 26946246
Fax: +91-11-26945499
Email:millitimes@gmail.com
www.barizmedia.com


بسم الله الرحمن الرحيم



آج بھی جولوگ ایک نئی یونیورسٹی کا ڈول ڈالیں گے انھیں اس بات کا خاص طور پر التزام کرنا ہوگا کہ یونیورسٹی کی بنیاد اس تصورِحیات پر رکھی گئی ہو جس سے قرآن کی دعوتِ تسخیر و اکتشاف عبارت ہے۔ ایک آفاقی، الہامی اور زندگی بخش تصورِحیات کے بغیر قائم کی جانے والی ہر دانش گاہ خواہ وہ اپنے مظاہر میں کتنی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو اور وسائل کی بہتات نے اس پر زندگی کا کتنا ہی دبیز ملمع کیوں نہ چڑھا دیا ہو اس کی اصل حیثیت روح سے خالی نالج انڈسٹری سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔

پیش لفظ

برسہابرس کے غور وفکر اور تحلیل و تجزیہ کے بعد اب جو چیزیں کسی قدر اپنی اصل ہیئت میں نظر آنے لگی ہیں اور مستقبل نگاہوں میں گاہے اس طرح جھلملاتا ہے گویا اچانک سب کچھ روشن ہونے کو ہے، تو بار بار یہ خیال بھی آتا ہے مبادا یہ سب کچھ محض آگہی کا دھوکہ نہ ہو۔ اللھم ارنی الاشیاء کما ھی کا ورد کرتے ہوئے کوئی ربع صدی گزری۔ اس دوران میری زندگی کا محور و مرکز بنیادی طور پر رسالۂ محمدی کی بازیافت رہا ہے۔ اس سوال نے مجھے ہر لمحہ پریشان کیے رکھا ہے گویا بقول شاعر ؎

کھویا گیا کس طرح ترا جوہر ادراک
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

یہ مختصر سی تحریر جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ ہماری تاریخ کے انتہائی اہم مسئلہ سے کلام کرتی اور ہمیں ایک بھیانک انحراف کے ازالہ کے لیے پیش قدمی کی دعوت دیتی ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا امت کو مغلوب اور امت کے بڑے بوڑھوں کو مغلوب الغضب پایا۔ جس امت کا گراف مسلسل گرتا جاتا ہو، جس کے احیاء کی ہر تدبیر باہمی رزم آرائیوں اور مسلکی و فقہی مناقشات میں دم توڑ دیتی ہو اور جہاں باہمی گروہ بندیوں کو دین کے مستقل اور مستند قالب کے طور پر قبول کر لیا گیا ہو اور جہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہو کہ شیعہ ہوں یا سنی، اسمٰعیلی ہوں یا اباضی یا امت کے دوسرے نظری گروہ، اب ان سبھوں کو اپنے انحرافات کے ساتھ ہی زندہ رہنا ہے، ایک ایسی مایوس کن فضا میں اسلام کے متحدہ اور اصل الاصل قالب کی بازیافت کی دعوت یقیناً ان لوگوں کی جھنجھلاہٹ میں اضافے کا باعث ہوگی جو صدیوں سے مختلف تراشیدہ قالب کے خوگر ہیں اور جنھیں اس بات کا شکوہ بھی ہے کہ ان کا یہ اسلام قرون اولیٰ جیسے نتائج پیدا نہیں کرتا۔ اب انہیں یہ کون سمجھائے کہ جس اسلام نے قرونِ اولیٰ میں گم گشتہ انسانی قافلوں کو شاہراہِ ہدایت پر گامزن کر رکھا تھا وہ نہ

شیعہ اسلام تھا اور نہ ہی سنّی اسلام سے اسے کوئی نسبت تھی۔ پھر اگر آج اصل اسلام کے غیاب سے ہمارا کارواں بے سمت ہو گیا ہے، بلکہ منصبِ سیادت سے ہماری بے دخلی کے سبب ایک ہلا مارنے والی بے سمتی تمام اقوامِ عالم کا مقدر بن گئی ہے تو اصلاحِ احوال کی کوئی کوشش رسالۂ محمدی کی بازیافت کے بغیر آخر کیسے بامراد ہو سکتی ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ اسلام کے اصل الاصل قالب کی گمشدگی نے ہم پر خود احتسابی کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں۔ صدیاں گزریں ہم دین و دنیا کی ثنویت کے علاوہ علم کی ثنویت کے قائل ہو گئے۔ ہمیں اس بات کا تو بخوبی اندازہ ہے کہ علم کی شرعی اور غیر شرعی زمروں میں تقسیم ایک گمراہ کن خیال ہے لیکن عملی طور پر صدیوں سے اس ثنویت کو ہم نے علمِ دین کے حوالے سے قبول کر رکھا ہے۔ مروجہ شرعی علوم اور ان کے خیرہ کن دواوین میں اس بات کی گنجائش خاصی کم ہے کہ اسلاف کے فہم سے ماوراء قرآن مجید کے صفحات میں خدا کی اس آواز کو براہِ راست سننے کی کوشش کی جائے کہ وہ کس طرح آج کے انسانوں سے مخاطب ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ مطالعۂ دین کے مروجہ منہج میں قرآن مجید کو پھر سے کھولنے، وحی ربانی سے راست ہدایت حاصل کرنے اور اس کی روشنی میں علوم شرعی کی اصل حیثیت متعین کرنے کا امکان کم ہی پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی دینی دانش گاہوں سے مسلکی اور گروہی اسلام کا غلغلہ تو بہت سنائی دیتا ہے البتہ کسی متحدہ پیمبرانہ اسلام کی بازیافت کی کوئی سعیٔ بلیغ دکھائی نہیں دیتی۔

ادھر مغرب کی جامعات علم و آگہی کے بجائے فریبِ آگہی کا سرچشمہ بن گئی ہیں۔ گزشتہ دو سو برسوں میں تحقیق و تجزیہ کے منہج میں سرمایہ دارانہ عزائم نے اپنا حصۂ رسدی رفتہ رفتہ اتنا زیادہ کر لیا ہے کہ اب یہ جامعات بنیادی طور پر سرمایہ داروں کی سروس انڈسٹری بن کر رہ گئی ہیں۔ ایسے علوم وضع کیے گئے ہیں جن کا مقصدِ وحید مغرب کی بالادستی اور سفید فام نسل کی برتری پر دلیل لانا اور مشرق کے اہلِ فکر کو ان کی وہبی کمتری کا قائل کرنا ہے۔ گو کہ اب اس غبارے سے بڑی تیزی کے ساتھ ہوا نکل رہی ہے لیکن سیادت کے خلا کو پر کرنے کے لیے امت مسلمہ میں کسی قابلِ ذکر ہلچل کا اب بھی فقدان ہے۔ ایسی صورت میں ایک ایسی دانش گاہ کا نظری خاکہ جو نہ صرف یہ کہ اسلام کے متحدہ قالب کی از سرِ نو تشکیل کر سکے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اقوامِ عالم کی مؤثر قیادت کا کام اپنے ہاتھوں میں لے سکے، وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہ مختصر سی تحریر اس سمت میں آپ کو ٹھنڈے اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ سنجیدہ غور و فکر اور ٹھوس اقدامی عمل کی دعوت دیتی ہے۔

راشد شاز

علی گڑھ، ۵ر فروری ۲۰۱۲ء

futureislam@gmail.com

ایک نئی یونیورسٹی کا نظری منصوبہ

مسلم ذہن ایک کربناک تشنج سے دوچار ہے۔ اس عمل پر کوئی ہزار سال کا عرصہ گزرا جب ایک کرم نما ثنویت اس کے فکری چوکھٹے میں سرایت کر گئی، تب سے اب تک اس ثنویت کے تدارک کی جتنی بھی کوششیں ہوئیں وہ بوجوہ بامراد نہ ہوسکیں۔ دین و دنیا کی اس بظاہر بے ضرر زمرہ بندی نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کچھ اس طرح دولخت کر رکھا ہے کہ اب بڑے بڑوں کو اس کی شیرازہ بندی کا خیال بھی نہیں آتا۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کچھ اس بات سے لگائیے کہ صدیوں سے مسلم معاشرے میں جدید اور قدیم دو الگ الگ ذہنوں کی آبیاری ہوتی رہی ہے۔ ایک علم شرعی کا شناور ہے تو دوسرا علوم دنیا کا ماہر۔ ایک کو دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ایک کا وجود دوسرے کے لیے ناقابل انگیز ہے۔ اول الذکر نے اگر علومِ شرعی کے حوالے سے آخرت پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے تو ثانی الذکر علومِ دنیا میں اپنی مہارت کے سبب خود کو سیادت کا سزاوار سمجھتا ہے۔ مسلمانوں کے یہ دو متحارب طبقے نہ صرف یہ کہ فکری اعتبار سے الگ الگ دنیا میں جیتے ہیں بلکہ زبان و بیان، تہذیب و معاشرت اور اپنے مخصوص ملبوسات سے بھی مسلسل اس بات کی شہادت دیتے رہتے ہیں کہ کبھی بنیان مرصوص کہی جانے والی یہ امت آج دولخت ہو کر رہ گئی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ امت کے زوال کے لیے روایتی علما کو موردِ الزام قرار دیتا ہے جو اس کے بقول بدلتی دنیا کی طرف مسلسل پیٹھ کیے بیٹھے ہیں جبکہ اہل جبہ کو یہ شکایت ہے کہ طبقۂ جدید کی بے راہ روی اور اس کو قبولیت عامہ مل جانے کے سبب مسلمان اپنے متعینہ راستہ سے دور جا پڑے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف الزامات و اتہامات کا سلسلہ گو کہ صدیوں سے

جاری ہے لیکن آج بھی صورت حال یہ ہے گویا یہ دونوں باہم برسرِ پیکار طبقے زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

جس امت کو داخلی فکری محاذ پر ایک بحرانِ مسلسل کا سامنا ہو، جس کا فکری اور نظری وجود لخت لخت ہو چکا ہو اور جس کے افراد خود کو ہر لمحہ باہم برسرِ پیکار پاتے ہوں، بھلا اس سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بیرونی محاذ پر اپنے واقعی دشمنوں کے خلاف کوئی متحدہ، فیصلہ کن اور مؤثر کارروائی کر سکے گی۔ قوموں کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اس کے عروج و زوال کا پہلا اور بنیادی محرک اس کے فکر اور اس کے اندرون سے برآمد ہوتا ہے۔ جب تک آپ کی ملی عمارت میں شگاف پیدا نہیں ہوتا دشمن کے لیے اس بات کا کوئی موقع نہیں کہ وہ اپنا نفوذ ممکن کر دکھائے۔

ماضی میں احیائے امت کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں ان کی توجہ داخلی انتشار کے تدارک پر کم ہی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فریق مخالف کے خلاف محاذ کھولنا تو آسان ہوتا ہے اور اس کے لیے ہنگامی حالات میں حمایت کا حصول بھی مشکل نہیں ہوتا، لیکن اس کے برعکس اپنے آپ کو فتح کرنا کچھ آسان نہیں۔ ہمارے فکری انحرافات اور داخلی خلفشار پر صدیاں گزر جانے کے بعد اب ہمیں یہ سب کچھ معمول کا عمل لگتا ہے اور شاید اسی لیے ہمارے کبار مصلحین بھی اسے قبول کیے لینے میں ہی عافیت جانتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کا مذہبی طور پر فرقوں اور مسلکوں میں منقسم ہو جانا خواہ وہ شیعہ سنی کی باہمی گروہ بندی ہو یا فقہی مسالک کی رزم آرائیاں یا علوم شرعیہ اور علوم جدیدہ کے مابین برپا نزاعِ مسلسل۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اختلاف کی ان بنیادوں پر تیشہ نہیں چلایا جاتا ہم ایک نئی ابتدا تو کجا خود کو ایک سرابِ مسلسل کے سفر میں مبتلا پائیں گے۔ فجر جدید کا ہر مژدہ ہم پر ایک صبح کاذب کی شکل میں طلوع ہوتا رہے گا۔

اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں جب علوم شرعیہ کی اصطلاح سے ہمارے حواس نا آشنا تھے، ایک ہمہ گیر علمی تحریک نے عالم اسلامی کو اپنے جلو میں لے رکھا تھا۔ مسجدوں کے حلقۂ درس، قصہ گورایوں کی لذت بیانیاں، فقہاء کی موشگافیاں، نحویوں کی نکتہ آفرینیاں، کتاّب کے ادارے، محدثین کے حلقے اور اکتشافی علوم کی بڑھتی لَے کے سبب آگے چل کر رصدگاہوں کا قیام، یہ سب کچھ قرآنی دائرۂ فکر کا فطری شاخسانہ سمجھے جاتے۔ یہ سب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے تردید نہیں۔ گو کہ ابتدائی صدیوں میں ہی قصہ گو راویوں کے غیر محتاط بیانات اور تراشیدہ روایات کی شہرت و اشاعت کے سبب ایک نئے بحران کی آہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔ اہل

علم نے اپنی بساط بھر اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے روایات و آثار کی تنقید و تطہیر کے پیمانے وضع کیے لیکن تب بھی کسی کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ وہ بعض علوم کو تو شرعی اور دینی قرار دے کر قبولیت تامہ بخشے اور بعض علوم کو غیر شرعی یا دنیوی قرار دے کر لائق نفریں بتائے کہ تب علم ایک وسیع اصطلاح تھی اور حکمت ضالۃ المومن کا نام تھا۔ مسلمان عالمی سیادت پر اپنے استحقاق کے سبب انسانی تہذیب اور علوم کے مجموعی ورثے پر اپنا حق سمجھتے۔ اخذ و اکتساب کی اس صحت مند روایت نے ایک انتہائی مختصر عرصہ میں اقوامِ عالم پر ان کی فضیلت قائم کر دی تھی۔

مسلم ذہن کی یہ دولختی جو آج ہمیں علومِ شرعیہ اور علوم جدیدہ کے حوالے سے نظر آتی ہے، باضابطہ طور پر تو نظامیہ بغداد کے مدارس سے منتج ہوئی، البتہ اس کی ابتدا فاطمیین کے مصر میں اس وقت ہو گئی تھی جب خلافت کے فاطمی دعویداروں نے سیاسی اور نظری پروپیگنڈے کے لیے باقاعدہ ایسے داعیوں کا ایک ہراول دستہ تیار کرنے کی ضرورت محسوس کی جو دین و مذہب کی زبان میں فاطمیوں کے استحقاق پر دلائل قائم کر سکیں۔ مذہب کی زبان میں سیاسی استحقاق کا یہ پروپیگنڈہ اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ جلد ہی عباسی بغداد کو نظامیہ مدرسوں کی شکل میں اصحاب شرع کے ادارے قائم کرنا پڑے۔ خلافت کے عباسی دعویداروں نے نہ صرف یہ کہ فاطمیین کے خلاف مخالفانہ پروپیگنڈے اور گمراہ کن فتاویٰ کا سلسلہ شروع کیا بلکہ کبار علمائے وقت کو باقاعدہ اس کام پر مامور کیا کہ وہ فاطمیین کے حسب و نسب پر شبہات وارد کریں اور انھیں باطل ٹھہرانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھیں۔ غزالی کی فضائح الباطنیہ اس سلسلہ کی ایک روشن مثال ہے۔

سیاسی پروپیگنڈے کو مذہب کی زبان مل جانے کا ایک نقصان یہ ہوا کہ بڑی بڑی صلاحیتیں اور اعلیٰ دماغ اہل علم اس وقتی اور نزاعی کام پر مامور ہو گئے۔ اہل شرع کے مدارس اور صوفیاء کی خانقاہیں سرکاری نوازشوں کے سزاوار قرار پائے۔ بڑے بڑے وقف املاک اور اقطاع کے نام سے گاؤں کے گاؤں ان نزاعی اداروں کے لیے وقف کر دیے گئے۔ نوبت بایں جا رسید کہ غزالی جیسا عالم جو خود اس نزاع میں ایک کلیدی رول ادا کر رہا تھا اور جو ان نوازشات سے خود بھی متمتع ہوا تھا وہ اس صورت حال پر خاموش نہ رہ سکا۔ اسے اس بات کا شکوہ تھا کہ اس زمانہ میں جو شخص جاہ و منصب کا طالب ہے وہ علوم شرعیہ کی دانش گاہوں کی طرف رخ کرتا ہے کہ سماجی اور سیاسی مراتب کے ساتھ بڑے بڑے وقف املاک پر تصرف اسی راستہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ رہے طب اور اس جیسے دوسرے اکتشافی علوم تو ادھر کوئی اس لیے جانا پسند نہیں کرتا کہ ان علوم سے وابستگان کے لیے نہ تو سیاسی اور سماجی توقیر کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی یہ انھیں اوقاف اور اقطاع کی سربراہی پر فائز کر سکتا ہے۔ فاطمیین کا

مصر ہو یا نظام الملک کا بغداد، دونوں کو ایسے علمائے شرع کی ضرورت تھی جو مذہب کی زبان میں مؤثر سیاسی پروپیگنڈے کا کام کرسکیں اور جوان حکمرانوں کے سیاسی استحقاق پر بزبانِ شرع دلائل قائم کرسکیں۔

روایات و آثار اور فقہ وتعبیر کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بڑے دوررس اور بھیانک اثرات مرتب ہوئے۔ آگے چل کر جب ان دو متحارب خلافتوں کی چپقلش ان کے غیاب کے سبب اپنے اختتام کو پہنچی اور یہ خلافتیں تاریخ کے اوراق میں گم ہوگئیں جب بھی سیاسی استحقاق کے ان متحارب دلائل سے ہمارا پیچھا نہ چھوٹا کہ یہ وقتی سیاسی پروپیگنڈہ علوم شرعیہ کی کتابوں میں مدون اور محفوظ ہو چکا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علومِ شرعیہ کی دانش گاہیں جو وقتی سیاسی ضرورت کے تحت قائم ہوئی تھیں انھیں ہمیشہ ہمیش کے لیے امت میں ایک عمومی استناد حاصل ہوگیا تھا۔ یہ خیال عام ہوا کہ علوم دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک علوم شرعیہ جسے مذہب کے حوالے سے تقدیس کا مرتبہ حاصل ہو چکا تھا اور دوسرا علوم العجم یا علوم جدیدہ جس کی بے توقیری اس کے عجمی الاصل ہونے سے ہی مترشح تھی۔ حالانکہ علوم کی یہ تقسیم جسے پہلی مرتبہ ابوعبداللہ الکاتب الخوارزمی (متوفی ۳۸۷ھ) نے اپنی کتاب مفاتیح العلوم میں متعارف کرایا تھا کوئی سوچی سمجھی اصطلاح نہ تھی۔ یہ ایک فہرست ساز کی اپنی تراشیدہ زمرہ بندی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ آنے والے دنوں میں اس کی وضع کردہ علوم شرعیہ کی یہ اصطلاح گمراہ کن التباسات کا سبب بنے گی اور مسلمان اس التباس کا شکار ہوجائیں گے کہ بعض علوم شرعی ہیں جن کے حاملین وارثانِ علوم نبوت کے حوالے سے تقدیس کے سزاوار ہیں جبکہ دوسرے علوم اہل عجم کے پرداختہ ہیں اور اس لیے انھیں اول الذکر جیسی توقیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

علومِ شرعیہ کے یہ ادارے جو وقتی سیاسی مصلحتوں کی پیداوار تھے جلد ہی ایک نئی پاپائیت کا علامیہ بن گئے۔ یہ خیال عام ہوا کہ دین کی تشریح وتعبیر کا تمام تر حق علمائے شرع کو ہے جن کی مذہبی حیثیت وارثانِ علوم نبوت کے حوالے سے مستحکم ہے۔ حالانکہ ان علمائے شرع کی بنا میں ابتدا ہی سے مسلکی اور فرقہ وارانہ طرز فکر نمایاں تھا۔ ان کی سرپرستی نظام وقت کے نظری ہراول دستہ کی حیثیت سے ہی کی جاتی رہی تھی۔ علمائے ازہر اگر فاطمیین کی خلافت کو برحق ثابت کرنے پر مامور تھے تو نظامیہ بغداد کے ادارے سنی فکر کے نقیب تھے، جن کا کام آلِ عباس کے سیاسی استحقاق کو جواز فراہم کرنا تھا۔ ان متحارب اور متنازع اداروں کو علومِ شرعیہ کا قلعہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف وجدال مسلم ذہن کا لازمہ بن گیا۔ یہ بات اب ناقابل تصور سمجھی جانے لگی کہ اسلام کا کوئی متحدہ پیغمبرانہ قالب بھی ہوسکتا ہے، جس پر متحارب روایتوں، سیاسی مناقشوں اور جدالِ فقہی کے اثرات نہ

پائے جاتے ہوں۔ تب سے اب تک مسلم فکر سنّیت اور شیعیت کے گردابِ محوری کی کچھ اس قدر اسیر ہے کہ آج ایک متحدہ اسلامی قالب کی تشکیل کا خیال عبث معلوم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کسی ایسے اقدام سے مروّجہ اسلام کی عمارت ہی زمیں بوس ہو جائے گی۔

علوم شرعیہ کی اصطلاح ایک اور بڑے التباس کو جنم دینے کا باعث ہوئی ہے وہ یہ کہ اسلام میں تشریح وتعبیر کا حق کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص ہے۔ اسلام جس حریت فکری کا نقیب ہے اور قرآن مجید میں رسول اللہ کو اصر واغلال سے نجات دہندہ کے طور پر جس طرح پیش کیا گیا ہے اس کے بعد تاریخ کا اس سے بڑا طنز اور کیا ہوسکتا ہے کہ طبقہ علماء کے حوالے سے ایک نئی پاپائیت نامحسوس طور پر ہمارے ہاں متشکل ہو جائے اور ان احبارِ اسلام کی شقی القلبی انھیں باقاعدہ فتووں کے اجرا پر آمادہ کرے اور وہ زبانِ حال وقال سے اس بات کے داعی ہوں کہ وہ بندوں اور خدا کے درمیان تشریح وتعبیر کے حوالے سے ایک مقامِ خاص کے حامل ہیں۔ حالانکہ ان فتووں کی نقیض خود ان فتووں سے مسلسل ہوتی رہتی ہے کہ ایک عالم کا فتویٰ دوسرے سے متصادم اور ایک کی فقہی بصیرت دوسرے کو مسترد کر رہی ہوتی ہے اور جس کے بطلان پر کسی اور کا نہیں خود قرآن کا یہ فتویٰ موجود ہے:

ولو کان من عند غیر الله لوجدوا فیه اختلافاً کثیرا۔

جن علوم شرعیہ کے حوالے سے علمائے تقدیس نے احبارِ اسلام کا منصب حاصل کر رکھا تھا خود اس کی تنگنائی کا حال یہ تھا کہ وہ مکمل انسانی زندگی کا احاطہ نہیں کرتے تھے۔ علمائے شرع کی قیل وقال کا محور ومرکز صرف آیات احکام تھے جن کی تعداد حسب توفیق ڈیڑھ سو سے پانچ سو آیات شمار کی جاتی تھیں۔ باقی ماندہ قرآن مجید یا تو محض کتاب تلاوت تھا یا عملاً معطل ومنسوخ کہ آیات اکتشاف علمائے شرع کے دائرۂ کار سے باہر سمجھی جاتی تھیں۔ قرآن مجید پر علمائے شرع کی اجارہ داری سے ایک دوسرا نقصان یہ ہوا کہ اکتشافی علوم کے حاملین کا تعلق رفتہ رفتہ کتاب ہدایت سے کمزور پڑتا گیا۔ مسلم معاشرہ جو کبھی حریت فکری کا نقیب تھا جہاں ایک بدوی عورت عمرؓ کے فہم قرآن پر برسرِ مجلس اعتراض وارد کر دیتی اور خلیفۂ وقت کو اپنے موقف سے رجوع کرنا پڑتا، علمائے شرع کے عروج کے بعد اس صحت مند مکالمہ کا کوئی موقع نہ رہا کہ اب فتویٰ کی کاٹ فتویٰ کی زبان ہی کر سکتی تھی۔ گویا تشریح وتعبیر طبقۂ علماء کا درونِ خانہ وظیفہ بن چکا تھا۔ عوام کالانعام کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان متحارب فتووں میں سے ہی کسی ایک کو اپنے لیے منتخب کر لیں کہ یہ مضحکہ خیز خیال عام تھا کہ چاروں ائمہ فقہاء بیک وقت حق پر ہیں، خواہ وہ بظاہر ایک دوسرے سے متصادم کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں۔

دین اسلام میں علوم شرعیہ کے منقح ہو جانے سے خود اسلام کی ایسی ہیئت تقلیبی ہوئی کہ رسالۂ محمدیؐ کا متحدہ قالب ہمارے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ وقتی سیاسی نزاع نے علوم شرعیہ کے تقدیسی عمل سے جلا پا کر شیعیت اور سنیت اور اس جیسے دیگر قالب پیدا کیے اور خود ان فرقوں کے اندر بھی علوم شرعیہ اور علوم جدیدہ کے حوالے سے متبعین محمدؐ مختلف خانوں میں بٹ کر رہ گئے۔

آج جب علوم شرعیہ کی اصطلاح پر کوئی ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے اور علمائے شرع کے ادارے نے دین مبین میں وارثین علوم نبوت کے حوالے سے تقدیسی اہمیت حاصل کر لی ہے، عام مسلمانوں کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا کچھ آسان نہیں کہ علوم شرعیہ کا مروّجہ تصور اور علمائے شرع کی تعبیری حیثیت ہمارے بحرانی تاریخ کی پیداوار ہے اور یہ کہ اسلام میں کسی قسم کی پاپائیت خواہ وہ سیاسی اور نسلی حوالے سے قائم ہوئی ہو، جیسا کہ خلافت کے فاطمی اور عباسی دعویداروں کا موقف تھا یا تشریح و تعبیر کے حوالے سے منقح ہوئی ہو، جیسا کہ احبارِ اسلام کا دعویٰ ہے، یہ سب کچھ دراصل دین مبین کی بنیادی تعلیمات اور اس کے مزاج سے مغائر ہے۔ خدا کی کتاب ایک ایسا لازوال عطیہ ہے جس سے ہر شخص اپنی بساط اور توفیق بھر اکتساب کا حقدار ہے۔ کسی کی سیاسی حیثیت یا علمی اختصاص اسے اس عمل میں لغزشوں سے ماورا قرار نہیں دے سکتا۔ مسلم معاشرہ بنیادی طور پر خدا سے بندے کے راست تعلق کے تصور سے غذا حاصل کرتا ہے۔ عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی رسولؐ کی قرآن فہمی پر ایک غیر معروف بادیہ نشین عورت شبہات وارد کر سکتی ہے۔ جنگ ردّہ کے اسیران کے سلسلے میں ابوبکرؓ کا سخت موقف عمرؓ اور دوسرے اصحابِ نبیؐ کے نزدیک غیر ثقہ قرار پا سکتا ہے اور خلیفۂ وقت اپنی تمام تر سیاسی قوت کے باوجود ان فیصلوں پر عمل درآمد سے گریز میں ہی عافیت جانتا ہے۔ جب ابوبکرؓ اور عمرؓ کا فہم قرآن چیلنج ہو سکتا ہے اور یہ حضرات اپنے موقف پر نظر ثانی یا گریز عمل کی ضرورت محسوس کر سکتے ہیں تو پھر ہما شما کے فتووں کو تقدیسی حیثیت عطا کرنے کا آخر کیا جواز ہے؟ رہے کبار فقہائے عظام جن کے حوالے سے سنی اسلام کے چار مختلف قالب کا وجود قائم ہے یا کبار شیعی مؤسسین جن کی کتب اربعہ نے شیعی اسلام کا قالب تیار کیا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ انھیں اس کام پر نہ تو خدا نے مامور کیا تھا اور نہ ہی ان حضرات نے رسول اللہ یا ان کے اصحاب کی صحبت پائی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بغیر آج ہمیں اسلام کو متصور کرنے کا خیال ناممکن العمل معلوم ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ اب تک امت میں تجدید و اصلاح کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں وہ اس مسئلہ سے دانستاً یا نادانستاً صرف نظر کرتی رہی ہیں۔ جب تک ہم اپنی شخصیت کو پھر سے مرصع نہیں کرتے، جب تک ہم اپنے

اندرون میں جاری اس فکری اور نظری خلفشار پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہوتے، جو ہر لحہ ہمیں لخت لخت کیے دیتی ہے، تب تک کسی نئی ابتدا کا خیال ان ہی پرانے دائروں میں لایعنی گردش پر منتج ہوگا۔ ایک نئی ابتدا کے لیے ایک ایسی شخصیت کی تعمیر کم سے کم شرط ہے جو تاریخ کے بجائے وحی ربانی سے راست غذا حاصل کرتی ہو، جو علوم کے اجتماعی سرمایہ سے نہ صرف یہ کہ واقف ہو بلکہ اس احساسِ گناہ سے اس کے دامن یکسر نا آلودہ ہوں کہ علومِ شرعیہ کے علاوہ دوسرے علوم کی طلب میں اس نے علم کی کسی کم تر شاخ کو اختیار کر رکھا ہے۔ رسالۂ محمدی سے اس کی واقفیت ائمہ اربعہ یا ائمہ اثناعشر کے تراشیدہ خانوں میں الجھ کر نہ رہ گئی ہو بلکہ تاریخی اسلام سے ماوراء دین کے متحدہ اور حقیقی قالب تک اس کی رسائی ہو۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ امت کو سیادت علیا کے منصب پر پھر سے متمکن دیکھنے کے لیے لازم ہے کہ ہم ان انحرافات والتباسات کی بساط لپیٹنے کی اپنے اندر ہمت پاتے ہوں جو تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمارے ہاں در آئی ہیں اور جنھیں بدقسمتی سے ہم دین اسلام کا حقیقی قالب سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

اس بات کی صداقت سے بھلا کون انکار کر پائے گا کہ ہمارے سیاسی زوال اور نظری التباسات و انحرافات کا ایک بنیادی عامل سیاسی نزاع کو مذہب کی زبان مل جانا رہا ہے جس نے آگے چل کر باقاعدہ شیعہ سنی خانہ جنگی کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس نزاع نے ہمیں جس طرح دولخت کیا اور جس طرح ہماری تاریخ اس باہمی معرکہ آرائی سے لہولہان ہے، اس کی کربنا کیوں کو کون محسوس نہیں کرتا؟ تب فاطمیوں کی خلافت یا آلِ بویہ کی امیر الامرائی اس بات کی طالب تھی کہ ایک فرقہ وارانہ اور مسلکی قالب روز افزوں ترقی پائے۔ دوسری طرف سنی اسلام کی تشکیل عباسی خلفاء کی سیاسی ضرورت تھی جس کے بغیر مساجد کے منبروں سے اللھم اغفر للعباس وولده مغفرة ظاهرة وباطنة لا تغادر ذنبا کی صدا بلند نہیں ہو سکتی تھی۔ اب جب یہ سیاسی چپقلش اور ان کے قائمین قصۂ پارینہ بن چکے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ان کی فکری باقیات ہمارے ملّی سفر میں مسلسل مزاحم ہوتی رہیں۔ اسی طرح علم کے سلسلے میں آج من حیث الامت ہم جن التباسات کے شکار ہیں اور جس کے سبب اکتشافی علوم پر ہماری گرفت مسلسل ڈھیلی پڑتی گئی ہے اس کے تدارک کے بغیر ہمارا ہر اقدامی عمل دراصل ہماری رجعت کی شہادت دے گا۔ ہمارے بہترین دماغ علومِ شرعیہ کے دھوکے میں جزوی، فروعی اور لاطائل بحثوں سے اشتغال جاری رکھیں گے۔ ان کا تقدیسی سایہ علم کے سلسلے میں ہمارے التباسات کو زندگی عطا کرتا رہے گا اور ہمارے اندر دو متحارب قسم کے مسلم دماغ اور مسلم شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں گی۔ دین و دنیا کی اس

ثنویت کو جب تک اعتبار حاصل رہے گا آخر کوئی ان کم تر درجہ کے علوم سے اشتغال کیوں کر کرے گا جن کے حصول سے اسے آخرت میں کامیابی اور دنیا میں وارثِ علومِ نبوت کی تقدیسی توقیر عطا نہیں ہو سکتی۔ ایک نئی ابتدا کے لیے صرف فرقہ وارانہ تاریخ کو لپیٹنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ اس بنیادی التباس کا پردہ چاک کرنا ہوگا جس نے علم کی روشنی سے ہمیں محروم کر رکھا ہے اور جس کے سبب تحلیل و تجزیہ کی ہر کوشش بامراد ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔

ہم اب تک اس خیال کے اظہار سے گریزاں رہے ہیں کہ علوم کی شرعی اور غیر شرعی کی تقسیم ایک غیر قرآنی اور گمراہ کن مغالطہ ہے، گو کہ ہمارے بعض سکہ بند علماء ماضی میں بھی زیرلب اس صورت حال پر احتجاج کرتے رہے ہیں۔ غزالی فقہ کو علومِ شرعیہ میں شمار نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک اس کا تعلق امور دنیا سے ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس زیرلب احتجاج کو ایک بے لاگ علمی محاکے کی شکل دی جائے اور بلا خوف لومۃ ولائم اس بات کا برملا اعلان کیا جائے کہ علوم کی شرعی اور غیر شرعی خانوں میں تقسیم فی نفسہ ایک غیر شرعی خیال ہے جو خالصتاً ایک بحرانی تاریخ کی پیداوار ہے اور جس کے جواز پر کتاب و سنت سے دلیل نہیں لائی جا سکتی۔ نکاح و طلاق اور فقہ و آثار کا علم بھی شرعی ہے اور انفس و آفاق کا باریک بیں مشاہدہ اور سیروا و انظروا کی دعوت پر لبیک کہنا بھی مطالباتِ شریعت کا ہی حصہ ہے۔ ہماری دینی دانش گاہوں میں عصری علوم کی شمولیت کا غلغلہ اگر کوئی خوش کن نتیجہ برآمد کرنے میں ناکام رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم علم کے سلسلے میں ان انحرافات و التباسات کا پردہ چاک کرنے میں ناکام رہے ہیں جس نے عباسی بغداد کے بحرانی لمحات میں ہمیں آلیا تھا۔ دوسری طرف عصری دانش گاہوں میں اسلامی علوم کی پیوندکاری اگر کوئی خوشگوار اثر مرتب کرنے میں ناکام رہی ہے تو اس کی وجہ بھی شرعی علوم کے سلسلے میں یہی التباسِ فکری ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم جن باتوں کو شرعی علوم سمجھ بیٹھے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ قرآنی تصورِ علم سے مغائر ہے بلکہ اس کی تشکیل و تدوین میں روزِ اوّل سے ہی ایک ناقص منہج علمی کو دخل رہا ہے۔ ذرا غور کیجیے تفقہ کا یہ اصول اربعہ جس میں قرآن مجید کے بالمقابل روایات و آثار، اجماع اور قیاس کو بھی یکساں اہمیت دی گئی ہو اور ان تینوں ظنی مآخذ کو بھی کتاب اللہ کے لازوال ماخذ کی طرح تعبیر و تدوین میں معتبر جانا گیا ہو، بھلا کسی ایسے منہج سے اختلافات کے علاوہ اور کیا برآمد ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان ظنی مآخذ نے کتاب ہدایت کی تجلیوں پر التباسات کی شدید دھند قائم کر رکھی ہے۔ قرآن مجید جو وحی ربّانی کا لازوال، غیر محرف اور حتمی وثیقہ ہے بسا اوقات تاریخ و آثار اور اجماع و قیاس کے تابع ہو کر رہ گیا ہے۔ جب

تک اس غیر علمی منہج کو چیلنج نہیں کیا جاتا اور کتاب ہدایت کی غیر مشروط حتمی حیثیت بحال نہیں ہوتی کسی نئی ابتدا کا خیال پرانے از کار رفتہ خیالات کی بے لذت جگالی پر منتج ہوگا اور ہم خود کو ایک گردشِ محوری میں مبتلا پائیں گے۔

بین بین کی بات بہت ہو چکی اب یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ تمام ائمہ فقہاء حق پر ہیں۔ دراصل اس قسم کی گمراہ کن وسعت قلبی نے ہی مدت سے ہمارے فکری قافلے پر روک لگا رکھا ہے۔ ہم نہ تو کسی واقعی تحلیل و تجزیہ کی اپنے اندر ہمت پاتے ہیں اور نہ ہی ہمیں اپنے انحراف فکری کی سنگینی کا واقعی احساس ہو پاتا ہے۔ عہد عباسی کی سیاسی مصلحتیں ایک صلح جو اسلامی ملغوبے کی طالب تھیں سو سیاسی مصالح کے تحت سنی اسلام نے خلفائے اربعہ کو سوادِ اعظم کے عقیدے کے طور پر پیش کیا۔ عباسی خطبہ میں آلِ عباس کی فضیلت کے ساتھ ہی تفضیل علیؓ اور پنجتن کا ذکر بھی شامل ہوا۔ یہ سیاست دانوں کی وقتی مصلحتیں تھیں کہ انھوں نے تاریخ کو عقیدے کے طور پر پڑھنے کی کوشش کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان وقتی تدابیر سے نہ تو امت کا اختلاف ختم ہوا اور نہ ہی متحدہ اور پیمبرانہ اسلام کی طرف ہماری واپسی ہو سکی۔ بلکہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے ہمارا ملّی وجود فرقوں اور طائفوں میں بٹتا گیا۔ پھر چونکہ علم کی روشنی ہمارے ہاتھوں سے پھسل چکی تھی اور واصل بن عطا کا عطا کردہ منہج علمی، جس پر تفقہ اور تدبر کی تمام عمارت قائم تھی، غور و فکر کا آخری حوالہ بن چکا تھا جسے عبور کیے بغیر قرآنی دائرۂ فکر میں ہماری واپسی ممکن نہ تھی۔ آج ایک نئی ابتدا کے لیے نہ صرف یہ کہ ہمیں علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کو مسترد کرنا ہوگا بلکہ اس التباسِ فکری سے باہر آنے کے لیے لازم ہوگا کہ ہم اصولِ دین اور اصول فقہ کا بھی از سر نو قرآنِ مجید کی روشنی میں بے لاگ محاکمہ کر سکیں، جبھی یہ ممکن ہے کہ ہم منہج علمی کی لغزشوں اور اس کے پیدا کردہ صدیوں پر محیط لٹریچر کے اثرات سے اپنے آپ کو کسی حد تک بچا سکیں۔ قرآنی تصور حیات کی تشکیلِ نو یا اس کی واپسی کے بغیر دینی مدارس میں عصری علوم کی شمولیت ایک بے ضرر بوجھ ہی معلوم ہوگا جس سے نہ تو شخصیت کی ثنویت ختم ہو سکے گی اور نہ ہی کسی واقعی غلغلہ انگیز مسلم ذہن کی تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو پائے گا۔

عصری دانش گاہوں کی صورت حال بھی کچھ قابل رشک نہیں۔ دینی درس گاہوں میں اگر وجدنا آبائنا کذالک یفعلون کا وِرد سنائی دیتا ہے تو ہماری عصری دانش گاہیں بھی تقلید غرب کا شاہکار نمونہ ہیں، جہاں خیال پیدا کرنے کے بجائے خیال درآمد کرنے پر سارا زور ہے۔ ان کی معراج اگر کچھ ہے تو یہی کہ وہ مغرب کے علمی اداروں سے خود کو زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کر لیں۔ ابتدا ہی سے یہ ایک طرح کے catch-up syndrome میں مبتلا ہیں جس سے کم از کم اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات قرآنی دائرۂ فکر کو مہمیز کرنے،

اس کے چشمۂ صافی سے جرعۂ زندگانی پینے اور علوم کا آبشار اپنے اندرون سے بہانے کے بجائے صرف باہر سے آنے والی روشنی پر اکتفاء کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے عظیم ماضی اور صدیوں پر محیط علمی اور سائنسی روایت سے ناواقف ہیں، جس کی روشنی بنائے مغرب میں شامل رہی ہے اور جس کے سبب آج مغرب بقعۂ نور نظر آتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کی عصری دانش گاہوں میں بھی علومِ اسلامی کی پیوند کاری اب تک کوئی نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے اور شاید اسی لیے علی گڑھ کے قیام سے لے کر OIC کی قائم کردہ اسلامی یونیورسٹیوں میں بھی اسے دینیات کے شعبہ یا اسلامیات اور علوم وحی کی فیکلٹی تک محدود رکھا گیا ہے۔ جہاں اسلامی علوم سے مراد شرعی علوم کا ناقص تصور ہو وہاں یہ بات کیسے سوچی جاسکتی ہے کہ تاریخی اسلام سے ماوراء اور مروّجہ منہج فقہی کے علاوہ بھی دین اور تعبیر دین کا کوئی انقلاب انگیز اور زندگی افزا طریقۂ کار ہوسکتا ہے۔ سرسید جنھیں عصری علوم کی ترغیب کے حوالے سے اولیت اور سبقت حاصل ہے کسی حد تک اس بات سے تو آگاہ تھے کہ دین کا مروّجہ فہم اور مطالعہ اسلامی کا مقبولِ عام منہج رسالۂ محمدی سے مغائر ہے۔ سرسید نے اپنے تہذیبی ورثہ کے سلسلے میں تو تحلیل و تجزیہ اور نقد و اعتراف کا صحت مند رویہ اختیار کیا جس سے کم از کم ایک نئے علم کلام یا ازسرنو غور وفکر کی امید پیدا ہو چلی، لیکن مغرب کے سلسلے میں ان کا رویہ معتقدانہ بلکہ مقلدانہ ہونے کے سبب وہ ایک نئی علمی روایت کی بناڈالنے میں ناکام رہے۔ انھوں نے کیمبرج اور آکسفورڈ کو، جن کی اسلامی طرز تعمیر پر مبنی قدیم عمارتوں کو دیکھ کر وہ مبہوت ہو گئے تھے، اپنے لیے نمونہ قرار دیا لیکن وہ مغربی پروپیگنڈے کے زیر اثر اس بات کو فراموش کر گئے کہ اس روایت کی داغ بیل اور اس کے ارتقاء وفروغ میں ہمارا ہی رنگ و روغن شامل ہے۔ 'علوم عربیۂ'، جو عہد وسطیٰ میں اکتشافی سائنسی علوم کے لیے مستعمل اصطلاح تھی، اگر مسلمانوں کے ہاتھوں یورپ کو منتقل نہ ہوئے ہوتے اور اگر صقلیہ اور اندلس کی مسلم دانش گاہوں میں عہد وسطیٰ کے یوروپی علماء کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہوا ہوتا، اگر گیارہویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک سائنس اور ٹیکنالوجی کی عربی کتابیں لاطینی اور دوسری مغربی زبانوں میں مسلسل ترجمہ نہ ہوتی رہتیں تو مغرب کی خیرہ کن سائنسی تہذیب جس سے سرسید مبہوت ہو گئے تھے، وجود میں نہ آسکتی تھی۔ اپنے عہد کے دوسرے علماء کی طرح سرسید بھی بدقسمتی سے سفید فام انگریزوں کی نسلی، سیاسی اور تہذیبی برتری پر ایمان لے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی تہذیبی روایت میں ایک نئے باب کے آغاز کے بجائے علی گڑھ نے پوری طرح مغرب کی علمی روایت کو بغیر کسی تحلیل و تجزیہ کے قبول کرلیا۔ انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ بعض دیانت دار انگریزوں کو علی گڑھ میں مسلمانوں کی نئی

نسل کو تہذیب سے مزین کرنے کی خدمت پر مامور کیا، لیکن اس پوری تگ ودو میں یہ بات نگاہوں سے اوجھل ہوگئی کہ علی گڑھ کو آکسفورڈ اور کیمبرج کا چربہ بنانے کی یہ کوشش چربہ دل ودماغ ہی پیدا کر سکتے تھے۔ طبع زاد اور قائدانہ دل ودماغ اس روایت میں تشکیل نہیں پاتے جو ہر لمحہ کسی catch-up syndrome میں مبتلا ہو۔ جلد ہی قدیم علمی روایت، اجتہاد واصلاح کی غلغلہ انگیز بحثیں، روایتی علوم کے شعبوں میں جز ومہمل بن کر رہ گئیں۔ خود سرسید کی ذاتی فہم وبصیرت اور تفسیر وتعبیر کا عظیم الشان علمی منہج علی گڑھ کی مقلدانہ فضا میں کا رِلایعنی قرار پایا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ علی گڑھ اپنے بانی کی حریت فکری اور ان کی مجتہدانہ فکر وبصیرت سے مسلسل مزاحم ہوتا رہا ہے۔ علی گڑھ کی خدمات اپنی جگہ لیکن یہ سب کچھ اس بہت بڑی قیمت کے سبب ہے جو اس کے بانی کو اپنے اصل عزائم سے مصالحت کی شکل میں ادا کرنا پڑی۔

عبدہٗ کا از ہر ہو یا شبلیؒ کا ندوہ یا اس قبیل کی تجدیدِ نصاب کی دوسری کوششیں، اس میں شبہ نہیں کہ سرسیدؒ کے مقابلے میں ان حضرات کو ایک جاری، گو کہ مضمحل، روایت کی بنیاد حاصل تھی لیکن یہ ایک منحرف روایت تھی جو وحیٔ ربانی سے کہیں زیادہ قدمائے یونان کی قیل وقال کی پروردہ تھی۔ پھر قدیم وجدید کی کوئی کوشش کسی نئی اسلامی صبح کی ضمانت کیسے دے سکتی تھی۔ از ہر ہو یا ندوہ منہج تعبیر میں وہ اپنے حریفِ مقابل دیوبند سے کچھ مختلف نہ تھا بلکہ آگے چل کر جب ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے علی گڑھ کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ایک نئے نظامِ تعلیم کا خاکہ پیش کیا تو وہاں بھی ان کی نگاہیں مروّجہ علوم شرعی کی تدوین میں الجھ کر رہ گئیں۔ اکتشافی علوم ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ یہ تمام حضرات اصلاح وتجدید کے شدید داعیات کے باوجود اسلام کے متوارث فہم کو اس کا اصل الاصل قرار دے بیٹھے تھے۔ قرآن مجید سے راست اکتساب کے تمام تر دعاوی کے باوجود ائمہ اربعہ کے خیمے سے وابستگی کو جز وایمان جانتے تھے۔ کلامی منہج کی مضرتوں پر اپنی وقیع تنقید کے باوجود ایک نئے منہج علمی کا ڈول ڈالنا امر محال سمجھتے تھے کہ اس سے متوارث اسلام کی تاریخی بنیاد ہل جاتی تھی۔ ان میں سے کوئی سنی تھا اور کوئی سنی حنفی یا شافعی یا حنبلی۔ زندگی بھر کا مطالعۂ اسلامی انھیں ان تراشیدہ انسانی حوالوں سے آزاد نہ کر سکا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوتا کہ وہ ائمہ اربعہ سے ماوراء، شیعہ سنی فرقہ بندیوں سے اوپر اٹھ کر اسلام کی اس متحدہ اور غیر محرف علمی روایت کی تشکیل کر پاتے جو حاملین کتاب کے ہاتھوں کتاب کائنات کے والہانہ مطالعہ سے عبارت ہے۔

ایک نئی ابتدا بالکل ہی نئے انقلابی اقدامات کی طالب ہے۔ غور وفکر کے پرانے سانچے جب تک نہیں

ٹوٹتے ایک نئے شاکلے کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ آج جب ہمارے علمی التباسات اور منہجی انحرافات پر کوئی ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے نئے اقدامات کے لیے کم سے کم شرط ایک نئے دماغ کی تیاری ہے جو یقیناً پرانی کتابوں کے وِرد سے تیار نہیں ہوسکتا۔ یہ نیا دماغ تشریح وتعبیر کے گھسے پٹے طریقوں کے بجائے قرآن مجید کو ایک نشانِ ہدایت کے طور پر کچھ اس طرح برتنے کا اہل ہوگا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شاہراہ وحی کی تجلّیوں سے جگمگا اٹھے۔ آیاتِ احکام کے ساتھ ساتھ آیاتِ اکتشاف بھی اس کی توجہ کا محور ہوگا، گویا پوری کتابِ ہدایت کو ایک وحدت رسالہ کے طور پر برتنے کی طرح ڈالی جائے گی اور اس طرح جعلوا القرآن عضین کی موجودہ صورت حال کا خاتمہ ہوسکے گا۔ ہمیں اولاً اس حقیقت کا ادراک کرنا ہوگا کہ آخری نبی کے متبعین کی حیثیت سے اب رہتی دنیا تک تاریخ کی کمان ہمارے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے۔ رسولؐ کے غیاب میں قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسے حجة بعد الرسل کی ہے جسے تمام اقوام عالم کے لیے منشورِ حیات کی حیثیت حاصل ہو۔ انسانی زندگی سے اس کی بے دخلی خواہ فکری ونظری التباسات کے سبب ہو یا تعبیر وتشریح، تاریخ وآثار اور کلامی وفقہی حیلوں سے اس کے مطالب پر پہرہ بٹھانے کی کوشش کی گئی ہو، ایسا کرنا صرف مسلمانوں کا ملّی نقصان نہیں بلکہ کاروانِ انسانی کی راہ گم کردینے کا موجب ہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے، جب سے عالمی سیادت سے ہماری معطّلی عمل میں آئی ہے، اس کے بھیانک نتائج مسلسل سامنے آرہے ہیں۔ ثانیاً ہمیں اس حقیقت کے اعتراف میں بھی کوئی تکلف نہ ہونا چاہئے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں دانش یونانی کے زیراثر جس اجنبی کلامی منہج کی گونج سنائی دیتی تھی وہ بالآخر واصل کے اصول اربعہ سے جلا پاکر ایک مستند منہج علمی کے طور پر رائج ہوگئی۔ کلامی طریقۂ جرح وتعدیل سے نکلنے کی ہر کوشش مزید اسی عمل کا توسیعہ بنتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ وتعبیر کے کسی آزاد منہج کی تشکیل کے امکانات معدوم ہوتے چلے گئے۔ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے مختلف سیاسی فرقوں نے اس منہج کو اپنے گروہی مقاصد کے لیے استعمال کیا سو جو لوگ فلسفہ کے مخالف تھے انھیں بھی اپنے مخالفین کے مقابلے کے لیے کلام میں استعداد بہم پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس طرح دین کی تشریح وتعبیر ہمیشہ ہمیش کے لیے ایک اجنبی منہج کی تابع ہوکر رہ گئی۔ نئے دماغ کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اس مروّجہ منہج علمی کی مضرت رسانیوں سے نہ صرف یہ کہ آگاہ ہو بلکہ وہ کتاب وحکمت کی روشنی میں ایک نئے منہج علمی کے قیام کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔ ثالثاً دانش یونانی نے رسالۂ محمدی کی مزاحمت میں منہج تعبیر وتفقہ کے علاوہ اکتشافی تحریک کا راستہ بھی روکنے کی کوشش کی تھی۔ یونانی علماء کی اکتشافی کتابوں کے ترجموں اور

ان کی تقلیب واصلاح میں عہد اموی اور عہد عباسی پر مشتمل چند قیمتی صدیاں ضائع ہوگئیں۔ اکتشافی علوم کے یونانی التباسات کو تو مسلمانوں نے مشاہدے اور تجربے کی میزان پر مسترد کر دیا اور اس کی جگہ علوم کی ایک نئی دنیا آباد کر ڈالی، البتہ فقہ وتعبیر کے کلامی منہج سے انھیں آج تک رہائی نہ مل سکی۔ نئے دماغ کے لیے صدیوں کی تعبیری روایت کا محاکمہ یقیناً کچھ آسان نہیں، لیکن اس کے بغیر ہر نئی ابتدا دراصل قدیم فرسودہ عمل کا توسیعہ ہوکر رہ جائے گی۔ رابعاً نئے دماغ کے لیے لازم ہوگا کہ وہ کتاب ہدایت سے اکتساب کے عمل میں تاریخ وآثار سے کام تو ضرور لے البتہ اسے فہم متن کی کلید نہ قرار دے ڈالے۔ وحی کا یہ مقام نہیں کہ اسے تاریخ وآثار کا تابع بنادیا جائے۔ ایک حتمی وثیقہ کو جس کے لفظ لفظ کی صحت شکوک وشبہات سے بالاتر ہو ظنی مآخذ کے حوالے کر دینا دراصل اس کی معطلی کے مترادف ہے۔ تاریخ کو نہ تو متن کی کلید قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تاریخ کا یہ مقام ہے کہ وہ دین اور عقیدے کا سا اعتبار حاصل کرلے، جیسا کہ شیعہ، سنی، حنفی، شافعی اور زیدی، جعفری فرقوں کو دین کا مستند قالب قرار دینے کا سبب ہوا ہے۔ نیا مسلم دماغ جسے فی زمانہ کارِ رسالت کو پھر سے مہمیز کرنا ہے نہ تو شیعہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی سنی اور نہ ہی حنفی، شافعی جیسے غیر قرآنی حوالوں سے اسے متہم کیا جانا چاہیے۔ خامساً ایک نئی ابتدا اس اعتراف حقیقت کا حامل ہے کہ قرآن مجید کی برپا کردہ علمی اور اکتشافی تحریک کے مطلوبہ نتائج برپا ہونا ابھی باقی ہیں۔ اجنبی منہج علمی کی سرایت اور اس کے نتیجہ میں آگے چل کر اکتشافی کے بجائے اساطیری طرز فکر کی مقبولیت نے بالآخر ہماری پیش قدمی پر روک لگادی۔ تسخیر واکتشاف کے داعیوں نے خود اپنے ہی ہاتھوں ۱۵۸۰ء میں استنبول میں قائم کردہ دنیا کی سب سے بڑی رصدگاہ کو منہدم کر ڈالا۔ یہ وہی عہد ہے جب ٹائیکو براہے مغرب میں یورپ کی پہلی رصدگاہ کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ آگے چل کر، کوئی پون صدی بعد، ۱۶۷۵ء میں انگلینڈ میں واقع گرین وچ کی پہاڑی پر برطانوی رصدگاہ کے قیام نے بالآخر سیادت کی تبدیلی کا اعلان کر ڈالا۔ گرین وچ مین ٹائم بہت جلد ساری دنیا کے لیے معیارِ وقت بن گیا۔ نئے مسلم ذہن کو اساطیری طرزِ فکر کو خیرباد کہتے ہوئے ایک بار پھر وقت اور تاریخ کی کمان کو اپنے ہاتھوں میں لینا ہوگا اور یہ تب ہی ممکن ہے جب اسے اس بات کا واقعی ادراک ہو کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ امت مامور ہیں جن کے بغیر تاریخ کا سفر بے معنی ہوجاتا ہے۔

نئے دماغ کی تیاری اور متحدہ مسلم شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک ایسی دانش گاہ کا قیام بڑے انقلابی نتائج کا حامل ہوسکتا ہے جہاں سب کچھ از سرنو کر دکھانے کا عزم پایا جاتا ہو۔ ایک ایسی تقلیبِ فکری جو ماضی کو عبرت

کے لیے بڑھتی، حال کو تحلیل و تجزیہ کی میزان پر پرکھتی اور مستقبل کو بصیرت کی روشنی میں دیکھنے کی اہل ہو۔ فی زمانہ دنیا بھر میں دانش گاہوں کے جو نمونے ہمارے سامنے ہیں اور جن کے دم سے موجودہ تہذیب کی چمک دمک قائم ہے خواہ یہ شرق میں واقع ہوں یا غرب میں پائے جاتے ہوں ان سے اخذ و اکتساب میں ہمیں کمال درجہ کی احتیاط برتنی ہوگی۔ مشرق میں اگر علم ثنویت کا شکار ہے تو مغرب میں بھی، خاص طور پر ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کے قیام کے بعد، ادب و فلسفہ اور سائنس و ٹیکنالوجی کے مابین خلیج مسلسل وسیع ہوتی رہی ہے۔ فلسفہ اور ادب کا طالب علم مغرب کی ٹکنالوجیکل تہذیب میں اجنبی اور تنہا ہو کر رہ گیا ہے۔ گویا علمی ثنویت اور شخصیت کی دولختی سے مغرب کی دانش گاہیں بھی محفوظ نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سوپر اسپیشلائزیشن نے روحِ جستجو کو کچھ اس طرح حصے بخرے کر دیا ہے کہ ایک عمومی ناآگہی ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ ایسی صورت میں مغرب کی اعلیٰ دانش گاہوں کو جوں کا توں درآمد کر لینا ہمارے مسائل کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ دانش گاہیں محض علم نہیں بانٹتیں اور نہ ہی کسی مجرد علم کا کوئی وجود ہے بلکہ یہ ایک تہذیبی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں جو دراصل اس تصورِ حیات کی رہینِ منت ہوتی ہیں جن کی تاریخی، مذہبی اور تہذیبی روایت نے انھیں تشکیل دیا ہوتا ہے۔ یہ مغالطہ کم گمراہ کن نہیں کہ مغرب کی اعلیٰ دانش گاہوں کو عالمِ اسلام میں منتقل کر لینے یا ان کے کیمپس کے قیام سے ہم چشم زدن میں اپنے علمی افلاس کا سدباب کر سکیں گے۔ مغرب کی دانش گاہیں اپنی تمام تر جلالتِ علمی اور اعلیٰ تحقیقی معیار کے باوجود دراصل اہلِ مغرب کے تصورِ حیات کی پروردہ اور امین ہیں۔ ان سے مطلوبہ مسلم دماغ تو کجا ایک بے لوث آفاقی طرزِ فکر کی تعمیر کا امکان بھی کم ہے۔ خود مغرب کے ژرف بیں علماء ان دانش گاہوں کے زوال اور بے رحم سرمایہ کاروں کے ہاتھوں اس کی پامالی کا تذکرہ کرتے رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کے واقعی ادراک کے لیے لازم ہے کہ ان امراض کی خاص طور پر نشان دہی کر دی جائے جن میں عہدِ جدید کی اعلیٰ ترین دانش گاہیں مبتلا ہیں اور جن سے اجتناب کی ہمیں ہر ممکن تدبیر کرنی ہوگی۔

اس میں شبہ نہیں کہ مغرب میں یونیورسٹیوں کے قیام اور اس کے ارتقا کی تاریخ اسلامی مشرق کے اثرات و احسانات سے مملو ہے۔ نئی تاریخ نویسی نے گزشتہ چند برسوں میں اس بات کے وافر ثبوت فراہم کر دیے ہیں کہ پالرمو، بلوگنا، پیرس اور آکسفورڈ کی یونیورسٹی عرب اسلامی اثرات کے نتیجے میں قائم ہوئی اور کوئی پانچ چھ صدیوں تک علومِ عربیہ یعنی اکتشافی علوم کے لاطینی اور مقامی ترجمے ان دانش گاہوں میں داخلِ نصاب رہے، حتیٰ کہ ۱۶۱۹ء تک آکسفورڈ میں جیومیٹری اور فلکیات کے اساتذہ کے لیے عربی زبان سے واقفیت لازم خیال کی

جاتی تھی۔ ابن سینا کے القانون فی الطب کا مغرب کی درس گاہوں میں متداول ہونا ہر خاص و عام کے علم میں ہے۔ ہم اس بات سے بھی ناآگاہ نہیں کہ فی نفسہٖ لفظ کالج کلیہ ہی کی معرّب شدہ شکل ہے اور یہ کہ یونیورسٹیوں میں نہ صرف یہ کہ بیچلر، ماجستر اور ڈاکٹریٹ کی درجہ بندی اسلامی مشرق سے مستعار کردہ ہے بلکہ تقسیم اسناد کے موقع پر ہڈ اور گاؤن کا لباس فاخرہ آج بھی اس روایت کے اسلامی الاصل ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ اس اعتبار سے مغرب کی دانش گاہیں ہمارے اکتشافی مشن کا ہی توسیعہ ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی ہی پیدا کردہ اس عظیم الشان علمی روایت کے سلسلے میں اپنے دلوں میں تنگی محسوس کریں۔ اگر انیسویں صدی میں یورپ میں دانش گاہوں کی تقلیب فکری نہ ہوئی ہوتی اور اگر بعض سیاسی عوامل کے تحت انھوں نے اوہام اور پروپیگنڈے کو علم و آگہی کے منصب پر فائز نہ کیا ہوتا اور آگے چل کر خاص طور سے امریکی ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کے وجود میں آجانے کے بعد سرمایہ داروں نے اسے اپنے مذموم مقاصد کی آماجگاہ نہ بنایا ہوتا تو ہمیں اس علمی روایت کو اپنی ترقی یافتہ شکل میں درآمد کرنے میں کچھ تکلف نہ ہوتا، لیکن افسوس کہ انیسویں صدی میں مغرب کے استعمارانہ ذہن نے نہ صرف یہ کہ اپنے تفوق کے جواز کے لیے نئے اساطیر تراشے اور انھیں مستند تاریخ کا درجہ دے ڈالا بلکہ ایسے علوم بھی ایجاد کیے جن کا بنیادی مقصد سفید فام نسل کے نسلی، سیاسی، تاریخی اور ذہنی تفوق پر دلیل لانا تھا۔ تاریخ ہو یا جغرافیہ نویسی، عمرانی علوم ہوں یا سائنٹفک ریس ازم سے مملو نام نہاد معروضی مشاہدات، انیسویں صدی میں مغرب کے دانشوروں نے اپنے تعصّبات اور اوہام سے علم کی ہر شاخ کو پامال کر ڈالا۔ استعمار کی صدیوں میں جہاں اسلامی مشرق اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھا، ان غیر علمی نظریات کو چیلنج کون کرتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب اپنے ہی پیدا کردہ تعصّبات کا قیدی بن کر رہ گیا اور اگلوں کے لیے مغربی علوم اور ان کی اتباع میں قائم ہونے والی دانش گاہیں دانشورانہ قید گاہیں بن گئیں۔ مثال کے طور پر فرائڈ کے سائکو انالسس کو لیجیے جس کا سکہ بیسویں صدی کے آخری ایام تک چلتا رہا ہے تا آنکہ نیوروسائنس کی جدید تحقیق اور برین میپنگ کے نئے آلات نے انسانی دل و دماغ کے سلسلے میں ایک بالکل ہی مختلف صورت حال کی خبر دی اور جس کے مطابق متصوفین کی کبریائی سے لے کر ڈپریشن کے مریضوں تک احساسات کی تبدیلی دراصل سیروٹونین میں سطح کی تبدیلی کے سبب بتائی جاتی ہے۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء جس نے بیسویں صدی میں ایک طرح کی سائنٹولوجی کو جنم دیا، آج DNA کی جدید تحقیقات کے سبب اپنا اعتبار کھوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح انتھروپالوجی کی وہ تمام قیاس آرائیاں جو اہل مشرق کو غیر عقلی اور وجدانی قرار دیتی ہیں اور اس کے برعکس مغربی

انسان کو ایک عقلی رویہ کا حامل بتاتی ہیں یا جو یہ بتاتی ہیں کہ سفید فام انسان کا دماغ دوسری اقوام سے نسبتاً بڑا ہوتا ہے، اب اپنا اعتبار کھوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ان جیسے دوسرے بہت سے گمراہ کن التباسات کی قلعی کھلنا ابھی باقی ہے۔ مارکس اور ویبر جیسے دو باہم مختلف تجزیہ نگار، جن کی فکری مداخلتوں نے مغربی ذہن کو مرصع کرنے میں اہم رول انجام دیا ہے، مشرق کے سلسلے میں ان کی گمراہ کن تاریخی بصیرت سے پردہ اٹھنا بھی ابھی باقی ہے۔ جب صورت حال یہ ہو کہ مغرب کے زیر اثر دنیا بھر کے اسکولوں میں رائج مرکیٹیئر کا تیار کردہ خریطۂ عالم غیر حقیقی صورت حال کا عکاس ہونے کے سبب مشرق کی تحقیر اور مغرب کی کبریائی کا کام انجام دے رہا ہو، جہاں محض پروپیگنڈے کے زور پر جزائر یورپ کا مختصر سلسلہ براعظم قرار پایا ہو اور ہندو پاک جیسی وسیع سرزمین کو مشترکہ طور پر sub-continent کا رتبہ مل سکا ہو، جہاں گرین لینڈ کا مختصر خطہ جو رقبہ میں چین کا ایک چوتھائی ہونے کے باوجود چین کے مقابلہ میں دوگنا دکھائی دیتا ہو، جہاں اسکینڈے نیویا ہندوستان کے مقابلہ میں رقبہ میں ایک تہائی ہونے کے باوجود اس کے ہم پلہ دکھائی دیتا ہو اور اس مغرب زدہ گمراہ کن خریطۂ عالم کے اصلاح کی علمی کوشش یہ کہہ کر رد کر دی گئی ہو کہ اصل اسکیل پر نقشوں کی ترتیبِ نو ذوق لطیف کے خلاف ہے، جیسے یہ دنیا کا نقشہ نہ ہو بلکہ کسی نے بد ہیئت، گیلے انڈر ویئر لٹکا دیے ہوں، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کی یہ جدید دانش گاہیں آزادانہ غور وفکر اور بے لاگ معروضی تجزیہ میں کتنی ممدومعاون ہو سکتی ہیں۔

یہ تو صرف ایک پہلو ہے اس دانشورانہ عقوبت گاہ کا جسے عرف عام میں آج یونیورسٹی کا نام دیا جاتا ہے ورنہ اصل صورت حال کہیں سنگین تر ہے۔ علم و تحقیق کی آزادانہ روایت کیسے قائم ہو جبکہ دل و دماغ پر تراشیدہ اوہام و اساطیر کے پہرے سخت ہوں۔ اب اگر ان دانش گاہوں کا نوحہ گاہے بہ گاہے خود ان ہی اداروں کے اندر سے سنائی دیتا ہے تو دراصل یہ وہ چند سعید، باغی اور بیدار مغز نفوس ہیں جنھوں نے مشکل ترین حالات میں بھی غور وفکر اور تنقید و محاکمہ کا کام جاری رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب کی اعلیٰ دانش گاہیں عالم نزع میں مبتلا ہیں۔ اب ان کی حیثیت ان منارۂ نور کی نہیں جن سے انسانیت رہنمائی حاصل کرے بلکہ تجارتی اداروں کی سروس انڈسٹری کی ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ اب صرف ڈزنی، ان ٹیل، مائکروسوفٹ اور ان جیسی دوسری کمپنیوں کے لیے ان کی فرمائش اور ضرورت کے مطابق افرادی قوت پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ بلکہ تحقیق و اکتشاف کا عمل بھی متمول سرمایہ کاروں کی خواہشات کا تابع ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسا اس لیے کہ تجارتی اداروں کی ایماء اور ان کی کفالت پر یونیورسٹیوں میں تحقیقی منصوبوں کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے جس نے یونیورسٹی کے غایت و

اہداف کو بڑی حد تک بے رحم سرمایہ داروں کی آرزوؤں کا تابع مہمل کر دیا ہے۔

اب جو لوگ یونیورسٹی کو اس کے اصل فریضۂ منصبی کے ساتھ پھر سے متصور کرنا چاہتے ہیں اور جو یہ چاہتے ہیں کہ اسے انیسویں صدی کے مغربی اوہام وتصورات سے نجات دلائیں، آزادانہ اور منصفانہ غور وفکر کی ریت پھر سے قائم ہو، ان کے لیے لازم ہوگا کہ وہ گزشتہ دو ڈھائی سو برسوں میں وجود میں آنے والے علوم کا کمالِ احتیاط اور عرق ریزی سے محاکمہ کریں۔ یہی وہ عہد ہے جب ہم سیادت کے منصب سے غائب رہے۔ مغرب جو صدیوں سے ہمارا متبع اور حریف چلا آتا تھا اس نے ہماری سیاسی مغلوبی سے فائدہ اٹھا کر تاریخ کو ازسرِنو لکھنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے تئیں بڑی ہوشیاری سے ہمیں اس تاریخ سے محروم کر دیا جو ہمیں ہماری اصل حیثیت پر مطلع کرتی اور آخری رسولؐ کی امت کی حیثیت سے ہمارے تاریخی کلیدی رول کے سبب ہمیں ایک ناقابلِ شکست اعتماد سے معمور رکھتی۔ استعمارانہ عزائم کے جواز اور سفید فام اقوام کی عالم گیر لوٹ کھسوٹ کو اعتبار بخشنے کے لیے علوم کی صنعتیں کام پر لگا دی گئیں۔ اس عمل پر کوئی دو ڈھائی صدیاں گزرنے کے بعد آج مغرب اپنی ہی تعمیر کردہ دانشورانہ عقوبت گاہ میں محصور ہے۔ اس صورتِ حال کو بدل ڈالنے کے لیے اب تک گاہے بہ گاہے جو صدائے احتجاج سنائی دیتی رہی ہے، وہ بڑی مضمحل ہے۔ اب یہ ہم اہلِ مشرق کا فریضۂ منصبی ہے کہ علمی روایت کے تاریخی اور فطری امین ہونے کے سبب اور اس سبب کہ رہتی دنیا تک اقوامِ عالم کی رشد و ہدایت کا کام ہم سے لیا جانا ہے، ہم تاریخ کے اس نازک اور فیصلہ کن لمحے میں اس علمی روایت کی تطہیر کا کام اپنے ہاتھوں میں لیں۔

یاد رکھیے! جس فکری پیراڈائم نے مسائل کو جنم دیا ہو اس پیراڈائم میں یہ قوت نہیں ہوتی کہ وہ ان مسائل کا ازالہ بھی کر سکے۔ استعمارانہ عزائم اور بے رحم سرمایہ داری نے علوم اور ٹیکنالوجی کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا تا آنکہ غور وفکر کے مغربی سانچے پامال اور پراگندہ ہو گئے۔ ساری دنیا پر سرمایہ داری کا مذموم شکنجہ سخت ہوتا گیا۔ ٹیکس کے جبری نظام میں فرد کی آزادی سلب ہو کر رہ گئی۔ ماحولیات کی تباہی اور اشیائے خورد و نوش کی حریصانہ تقلیب و تمسیخ کے سبب فرحت بخش غذا کا حصول مشکل ہو گیا۔ اب اس مسخ شدہ علمی ادارے سے یہ توقع کرنا کہ وہ ان مسائل کے حل میں ہماری مدد کر سکیں گے، پرلے درجہ کی سادہ لوحی ہوگی۔ ان کے پیش کردہ حل مزید مسائل کو جنم دیں گے۔ ہر حل دراصل ایک نئی مشکل کا آغاز ہوگا۔ ایسا اس لیے کہ یہ دانش گاہیں پرانے پیراڈائم سے باہر آ کر سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ دینی اداروں یا مدرسہ کو مجہلہ قرار دینے کا فیشن تو عام

ہے لیکن جدید دانش گاہوں کی بند دماغی اوران کے برپا کردہ ماحولیاتی فساد، معاشی بحران اور سیاسی جبر کی طرف ہماری نگاہیں کم ہی اٹھتی ہیں۔ مدرسوں پر اگر تقلید یونان اور تقلید آباء کا ماحول طاری ہے تو مشرق کی جدید یونیورسٹیاں بھی مغرب سے آنے والی ہر آواز کو بمنزلہ وحی سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اوّل الذکر جدید دنیا سے بے تعلق اور عضو معطل ہو کر رہ گئے ہیں تو ثانی الذکر کی چہل پہل کارپوریٹ کی فدویانہ خدمات کے دم سے قائم ہے۔ ایک نئی صبح کے قیام کے لیے لازم ہے کہ ہم قدیم وجدید سے ماوراء اور شرق وغرب کے تعصّبات سے دامن بچاتے ہوئے ایک ایسی دانش گاہ کا ڈول ڈالیں جو مروّجہ فکری پیراڈائم کے استرداد پر قائم ہوئی ہو اور جہاں ایک نئی شروعات کے لیے سیاسی، نفسیاتی، جغرافیائی، نسلی اور قومی مزاحم انتہائی کم پائے جاتے ہوں۔

ذرا غور کیجئے! عالمی سیادت سے مسلمانوں کے مؤثر انخلاء پر ابھی دو ڈھائی صدیاں گزری ہیں اور علامتی عثمانی خلافت کے غیاب پر ایک صدی بھی مکمل نہیں ہوئی ہے لیکن اس مختصر عرصہ میں انسانوں پر کون سی افتاد ہے جو نہ گزری ہو۔ جب سے اقوام یورپ کو سیادت کے مرکزی اسٹیج پر مؤثر رول ادا کرنے کا موقع ملا ہے چہار دانگ عالم میں ظلم واستبداد کے سایے مسلسل گہرے ہوتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کولمبس جس کے بحری سفر کا رومانوی تذکرہ ہم بڑے شوق سے سنتے آئے ہیں، اس کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کہ صلیبی طالع آزماؤں نے وسائل کے حصول میں صرف پچاس سالوں کے اندر نئی دنیا امریکہ کی اسّی ملین کی مقامی آبادی میں سے ستر ملین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سولہویں صدی میں میکسیکو کی آبادی پچیس ملین نفوس پر مشتمل تھی جو اس صدی کے اختتام تک صرف ایک ملین ہو کر رہ گئی۔ ان نوآبادیات میں جبراً مزدوری کے لیے سیاہ فام افریقی باشندوں کو غلام بنایا گیا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں سفید فام یوروپی اقوام نے تہذیب کی اشاعت کے نام پر عمومی لوٹ کھسوٹ کا وہ بازار گرم کیا اور اتنے بڑے پیمانے پر تہذیب ومعاشرت کو تلف کیا کہ منظّم نسل کشی کی ایسی تصویر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ مصیبت یہ ہوئی کہ مہذب دنیا کا کوئی قابل ذکر خطہ اس جارحیت سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اب تک انسانی تہذیب نے فرحت بخش زندگی جینے اور بقائے باہم کے جن امکانات کی تشکیل وتزئین کی تھی اور جس کے سبب جاوا، سماترا سے لے کر مراکش کے ساحلوں تک بحر اوسط کے دونوں طرف اور خود جزیرہ ہائے یورپ میں تہذیب کا جو مشترکہ قالب تشکیل پایا تھا، استعمارانہ کاسہ لیسیوں نے وہ سب کچھ تباہ کر ڈالا۔ لہلہاتے کھیتوں اور سرسبز وشاداب علاقوں کے حصول کے لیے انسانوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کا کچھ اس منظّم طریقے سے شکار کیا کہ بعض نسلیں صفحۂ ہستی سے معدوم ہوگئیں۔ اتنے

بڑے پیمانے پر تہذیب کی تاراجی کے خلاف بجا طور پر توقع کی جاتی تھی کہ مغرب کے باضمیر انسانوں کی طرف سے اس صورت حال پر ایک عمومی بغاوت کی کیفیت جنم لے گی، مگر مصیبت یہ تھی کہ جن لوگوں نے جنگ و غارت گری کو مسلسل تجارت کی شکل دے رکھی تھی انھوں نے کمالِ عیاری کے ساتھ علمی اور تحقیقی اداروں کی موثر تقلیبِ فکری کر ڈالی تھی۔ اور جیسا کہ ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں مغرب کی جامعات کا بنیادی فریضہ اب اس رزمیہ کی تشکیل اور اس کی تقدیس کا نغمہ گانا تھا جس کے مطابق اقوام مغرب سیادتِ عالم کے فطری سزاوار بتائے گئے تھے۔ مغرب میں یونیورسٹی کی یہ تقلیبِ فکری نہ صرف یہ کہ اس منارۂ نور کی تباہی کا سبب ہوئی جو نازک بحرانی لمحات میں اقوامِ مغرب کی گمرہی کا مداوا کر سکتی تھی بلکہ مسلمانوں کے عالمی افق سے غیاب کے سبب پوری دنیا پر ایک نئے عہدِ ظلمت کے طلوع کا سبب بھی بن گئی۔

نئی ابتدا کے لیے لازم ہے کہ ہم اس نکتہ سے پوری طرح آگاہ ہوں کہ یونیورسٹی کا فریضہ محض تعلیم و تعلّم یا تحقیق و اکتشاف نہیں بلکہ اس تصورِ حیات کو زندہ و تابندہ رکھنا بھی ہے جس میں تمام اقوامِ عالم کی یکساں فلاح و بہبود کے امکانات پائے جاتے ہوں۔ یونیورسٹی کی حیثیت ایک ایسے نشان راہ کی ہے جو ہمیں اس بات پر مسلسل مطلع کرتی رہتی ہے کہ آگے تاریخ کا سفر کن سمتوں میں طے پانا ہے۔ قرآنی دائرۂ فکر کی حامل یونیورسٹیاں ضروری نہیں کہ صرف مسلم معاشروں میں پائی جائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ آج یہ ممکن ہو سکا ہے کہ مغربی اور سرمایہ دارانہ تصورِ حیات کی حامل جامعات مسلم معاشروں میں متحرک رہیں اور ان کی نظری اجنبیت کا کسی کو احساس بھی نہ ہو۔ عہد وسطیٰ کے یورپ میں جہاں تعلیم و تعلّم کا نظم اور کتاب کائنات پر غور و فکر کی قرآنی روایت نے یورپ کی یونیورسٹیوں کے قیام اور استحکام میں کلیدی رول انجام دیا تھا وہاں کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ تحقیق و اکتشاف کی یہ روایت دراصل مسلمانوں کی علمی ثقافت کا توسیعہ ہے اور یہ کہ اس کی جڑیں وحی ربانی کے صفحات میں پائی جاتی ہیں۔ آج بھی جو لوگ ایک نئی یونیورسٹی کا ڈول ڈالیں گے انھیں اس بات کا خاص طور پر التزام کرنا ہوگا کہ یونیورسٹی کی بنیاد اس تصورِ حیات پر رکھی گئی ہو جس سے قرآن کی دعوتِ تسخیر و اکتشاف عبارت ہے۔ ایک آفاقی، الہامی اور زندگی بخش تصورِ حیات کے بغیر قائم کی جانے والی ہر دانش گاہ خواہ وہ اپنے مظاہر میں کتنی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو اور وسائل کی بہتات نے اس پر زندگی کا کتنا ہی دبیز ملمع کیوں نہ چڑھا دیا ہو ان کی اصل حیثیت روح سے خالی نالج انڈسٹری سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ شرق اوسط کی بیشتر دانش گاہیں جو اس معصوم اور موہوم توقع کے ساتھ قائم کی گئی ہیں کہ شاید اس طرح

چشم زدن میں علوم کی کھیتی لہلہا اٹھے اور ایک بار پھر عالم اسلام اپنے سابقہ علمی تفوق کے عہد میں واپس آ جائے، اگر روزِ اوّل سے ایک طرح کی بے نشاطی میں مبتلا ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں یونیورسٹی کے تمام لوازم کے ساتھ مغربی ذہن اور مغربی تصورِ حیات بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر درآمد کر لیے گئے ہیں۔ کہیں شوقِ سیادت اور کہیں جوشِ اصلاح میں یہ نکتہ یکسر نظر انداز ہو گیا ہے کہ ہر شخص بنیادی طور پر ایک تاریخی اور ثقافتی شخصیت بھی ہوتا ہے۔ تصورِ حیات کی تبدیلی کے ساتھ ہمارے خواب بھی بدل جاتے ہیں۔ ایک مہذب شخص کی فطرت ثانیہ اس تہذیب سے تشکیل پاتی ہے جس کا وہ پروردہ ہوتا ہے، گویا فرد کے خواب کا یونیورسٹی سے رشتہ بہت گہرا ہے اور اس بات میں کچھ حرج بھی نہیں کہ بے رحم امریکی ثقافت اور جابر سرمایہ دارانہ نظام کے پروردہ امریکی دانشور کا خواب مسلمان عالم سے یقیناً مختلف ہونا چاہئے۔ ہمیں یہ بات بھی سمجھنی ہوگی کہ علمی روایت خریدی نہیں جاتی اور نہ ہی کرایے کے مشیر کسی قوم کو سیادت جیسے منصب عظیم کے لیے تیار کر سکتے ہیں، بلکہ اندیشہ ہے مبادا مغرب کی دانش گاہوں کو جوں کا توں برآمد کر لینا خود ہمارے خواب کی تبدیلی کا سبب نہ بن جائے۔

دائرۂ فکر اگر محفوظ و مامون ہو اور اہدافِ زندگی واضح ہوں تو تحقیق و اکتشاف کی نئی دنیا آباد ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ ماضی میں ہماری دانش گاہوں نے تمام التباسِ فکر و نظر کے باوجود اگر تہذیب انسانی کے سفر کو آگے بڑھانے میں مؤثر رول ادا کیا ہے تو اس کا سبب یہی تھا کہ ہم اپنے نظری اور دینی فریضۂ منصبی کی رفعتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ آج بھی اگر ہمارے خواب ہمیں واپس مل جائیں تو ہماری دانش گاہیں شوقِ جستجو کی نئی آماجگاہ بن سکتی ہیں، پھر ہمیں مروّجہ نظامِ تعلیم کو جوں کا توں برآمد کرنے، علوم کو خانوں میں تقسیم کرنے اور طالب علموں کے دماغوں کو مغربی اقدار اور ان کی ہیبت علمی سے مملو کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ ہمیں اس حقیقت کا ادراک جتنا جلد ہو جائے بہتر ہے کہ یونیورسٹی کا موجودہ نظام جہاں علوم کی زمرہ بندی اور تقسیم یک رخے علما کو جنم دینے کا باعث بنی ہے وہیں داخلے اور امتحانات کے مروجہ میکانیکی نظام میں غیر معمولی اور عبقری صلاحیتوں کے نمو پانے کا امکان معدوم ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ سارا نظام ایک طرح کی mediocrity کے لیے تشکیل دیا گیا ہے جو فارغین کو سرمایہ دارانہ نظام کے میکانیکی کل پرزوں سے کچھ زیادہ تسلیم نہیں کرتا۔ پھر یہاں ایسے لوگوں کے لیے گنجائش کیسے نکل سکتی ہے جو اس تعلیمی نظام کی خامیوں کے اعلان کے ساتھ ہی اس کی بساط لپیٹنے کا عملی اقدام بھی کر سکیں۔ نئی مجوزہ دانش گاہ کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا تعلیمی نظام وضع کرے جہاں عبقری دماغ اور شوقِ جستجو سے معمور و مضطرب طلباء اپنے غایت و اہداف کے حصول کا وافر امکان پائیں۔

دائرۂ فکر کی حفاظت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نئی یونیورسٹی کسی مولویانہ معتقدات کی حامل ہو، جیسا کہ مسالک کی دانش گاہیں اپنے اساتذہ اور طلباء سے خاص مسلکی فکر کے فروغ واستحکام کی توقع کرتی ہیں یا جیسا کہ کیتھولک یونیورسٹی کے مؤسسین ایک طرح کی moralising کو فریضۂ منصبی جانتے ہیں۔ بلکہ اس سے مراد ایک ایسے صحت مند ماحول کی تشکیل ہے جہاں طالب علم خود اپنی زندگی کے غایت واہداف کو طے کرنے کے لیے آزاد ہو۔ خدا کی کائنات میں امین کائنات کی حیثیت سے وہ اپنے لیے کس رول کو پسند کرتا ہے یہ طے کرنا خود اس کا کام ہے بلکہ اسے اس بات کی بھی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ قرآنی تحریک اکتشاف کے غایت و اہداف کی از سرِنو تعبیر کر سکے۔ گویا تعبیرات کے محاکمہ کا کام مسلسل ایک عمل ہو۔ یہی طریقہ ہے دائرۂ فکر کی حفاظت کا اور زندگی کو نئی رفعتوں سے مسلسل آراستہ کیے رکھنے کا۔

علم جب تک میکانیکی درس گاہوں کی دست وبرد سے محفوظ تھا، مسجد سے رصدگاہ تک اور کتّاب سے فقہاء ومحدثین اور قصاص کی مجلسوں تک ایک ہی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو مرصع کرنے کا عمل جاری رہتا۔ طبیب اور ادیب، فقہاء وسائنس داں، قسمت آشنا اور فلک شناس سبھوں پر قرآن مجید کے بنیادی مطالب اور معاشرے کے غایت واہداف واضح ہوتے۔ آیاتِ کائنات جملہ علوم کی روشنی میں مطالعہ کی میز پر ہوتی۔ تب علم کا حصول ایک طرح کی طمانیت قلبی عطا کرتی۔ انما یخشی الله من عباده العلماء کی یہ عمومی فضا علوم کی وحدت کی پیدا کردہ تھی۔ یہ کہنا کہ وہ عبقری شخصیات کا زمانہ تھا جب یونان سے لے کر سولہویں صدی تک کے عالم اسلام میں ایک ہی شخص طبیب بھی ہوتا تھا اور فلسفی بھی، فقیہ بھی ہوتا تھا اور کیمیاگر بھی، موقیت بھی ہوتا تھا اور ماہر فلکیات بھی، دراصل عہد حاضر کے انسانوں کی تحقیرِ بے دلیل ہے۔ کانٹ کی اصطلاحِ مستعار میں اسے 'self-imposed immaturity' میں مبتلا کرنا ہے اور شاید یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ اپنی اصل حیثیت اور امکانی صلاحیت سے ناواقف سرمایہ دارانہ نظام کے کل پرزے کی حیثیت سے کام پر لگا رہے۔ نئی مجوزہ یونیورسٹی کو موجودہ یونیورسٹیوں میں پائی جانے والی ناآگہی کی اس فضا کو ختم کرنے کے لیے مؤثر منصوبہ بندی کرنی ہوگی، جبھی یہ ممکن ہے کہ ہماری دانش گاہوں سے ذہنی نابالغوں کی فوج ظفر موج نکلنے کے بجائے ایسے عبقریوں کی نسل نکل سکے جو فکر وفن کی دولت سے آراستہ ہوں، جو قائدانہ اعتماد سے سرشار دنیا کو بدل ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ پیشہ ورانہ کورسز کے فارغین جو ناآگہی اور ذہنی نابالغی کے سبب زندگی کے اعلیٰ غایت و اہداف کا ادراک نہیں رکھتے اور جو حقیر منفعت کے عوض اپنی زندگیوں کو بین الملکی کمپنیوں کے ہاتھوں بیچنے کے

لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، ان کے مقابلے میں وہ لوگ جو اس مکروہ نظام کی مکاریوں سے واقف ہوں اور جنھیں اپنی زندگی کی اصل قیمت اور بے پناہ امکانات کا احساس ہو وہ یقیناً اس صورت حال کو ٹھنڈے پیٹوں نہیں برداشت کر سکتے۔ نئی دانش گاہ کو ایسے علماء تیار کرنے ہوں گے جو صحیح معنوں میں polymath یعنی شیخ الکل ہوں۔ ایک ایسا نصاب تعلیم وضع کرنا ہوگا جو طلباء کو زوال پذیر سرمایہ دارانہ نظام کا آلہ کار بنانے کے بجائے انھیں نئی تبدیلیوں کے لیے مرجع (empower) کر سکے۔

مجوزہ یونیورسٹی کو مستقبل شناس اور زندگی آشنا ہونا چاہیے۔ اس کی حیثیت ایک منارۂ نور یا قبلہ نما کی تو ضرور ہو، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے فارغین اخلاقی وعظ ونصائح تک خود کو محدود رکھیں یا آگہی کا زعم انھیں بسم اللہ کے گنبد میں محصور کر دے۔ ہم کوئی عالم خیال قائم کرنے نہیں اٹھے ہیں اور نہ ہی ہمارا کام کسی غیر عملی utopia کی تشکیل ہے۔ ہم تو اس دائرۂ فکر کی از سر نو تشکیل کے لیے کوشاں ہیں جس نے نزول قرآن کے بعد ایک علمی اکتشافی تحریک کو جنم دیا تھا اور جس کے سبب متبعین محمدؐ کے ہاتھوں میں تاریخ کی لگام تھما دی گئی تھی۔ قرآنی دائرۂ فکر میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام عہد وسطیٰ کے ماحول کو پھر سے متصور کرنا ہرگز نہیں بلکہ نئی بدلی ہوئی صورت حال میں اقوام عالم کو نشاط انگیز زندگی سے آشنا کرنا ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب مجوزہ یونیورسٹی اپنے اطلاقی اور عملی ہونے کا احساس دلا سکے۔ مثال کے طور پر کھانا، کپڑا اور مکان کی بنیادی ضرورتوں کو لیجئے۔ فرحت بخش غذا جسے اب organic food کا نام دیا گیا ہے اور جو اب عام انسانوں کی دسترس سے باہر ہے، اس کی عمومی دستیابی کے امکان کو تحقیق و تجزیہ کا موضوع بنانا ہوگا۔ اب تک قدیم، فرسودہ، زوال زدہ سرمایہ دارانہ تہذیب کے انجینئر بلند بالا عمارتوں اور فلک بوس ٹاوروں کی تعمیر کو اپنے فن کی معراج سمجھتے رہے ہیں۔ انھیں اس بات کا چنداں اندازہ نہیں کہ آنے والے دنوں میں جب توانائی کی فراہمی مشکل ہوتی جائے گی اور جب توانائی کا کثرتِ استعمال ماحولیات کی تباہی پر منتج ہوگا اور بالآخر ہم توانائی کے بے مہابا استعمال سے خود کو روکنے پر مجبور پائیں گے، اس وقت یہ متروک فلک بوس عمارتیں آثار قدیمہ کا منظر پیش کریں گی۔ جو لوگ آج بھی اسی طرز تعمیر کے تعلیم و تعلّم میں مصروف ہیں وہ یقیناً ایک فرسودہ طرز فکر کے نقیب ہیں۔ اس کے برعکس مستقبل آشنا منصوبہ سازوں کی تمام تر توجہ اس امر پر ہونی چاہیے کہ توانائی کے کم سے کم استعمال اور ماحولیات کی آلودگی کے بغیر ایسے رہائشی منصوبے کیسے تشکیل دیے جائیں جو فطرت سے اپنی ہم آہنگی کے سبب جنت ارضی کا سماں پیش کرتے ہوں۔ مستقبل کی نشاط انگیز زندگی کا یہ نقشہ اس وقت تک ترتیب نہیں دیا جا سکتا جب

تک کہ ماحولیات، انجینئرنگ، علم الارض، آرکیٹیکچر ، الیکٹرانکس، ایگریکلچر اور عمرانیات کے علماء یا مخزن العلم (polymath) شخصیتیں اس منصوبے میں مشترکہ حصہ نہ لیں۔ ازمنۂ قدیم سے ہم فطری توانائی کے مختلف ذرائع استعمال کرتے آئے ہیں۔ ونڈمل، واٹرمل ماحولیاتی ہم آہنگی کے باوجود ہماری ضرورتوں کی کفالت نہیں کرسکتے۔ اٹامک انرجی کے بعد اب فیوجن انرجی کے حصول کی جدوجہد جاری ہے۔ یہ بات طے ہے کہ مستقبل میں جو توانائی کے ماخذ کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں ہوگا اسے یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ وہ اقوامِ عالم کی ترجیحات کو متعین کرسکے۔ مجوزہ یونیورسٹی کو اس قسم کے علمی چیلنج کو قبول کرنا ہوگا تاکہ وہ جدید دنیا میں ہونے والی مختلف تحقیقات کے مالہ و ماعلیہ کا قرار واقعی جائزہ لے کر قائدانہ اقدامات کرسکے۔ ہم کسی متبادل military-industrial-complex کے قیام کے لیے نہیں اٹھے ہیں لیکن ہم اس نکتہ سے ناآگاہ بھی نہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں جن لوگوں نے اقوامِ عالم کی قیادت کی ہے ان پر اس آیت قرآنی وانزلنا الحدید فیھا بأس شدید کا مفہوم خوب واضح تھا۔ ہم جب تک بی-۵۲ بمبار طیاروں، ڈرون حملوں اور ان جیسی دوسری حربی ٹیکنالوجی کے مؤثر دفاع کا سامان نہیں کرتے یا ان کے متبادل اور مقابل اسلحوں کی ایجاد پر قادر نہیں ہوتے، سیاسی محکومی اور ذہنی غلامی ہمارا مقدر رہے گی۔ کرایے کے دانشور اور تنخواہ دار علمی مشیر ہمیں زیادہ سے زیادہ جالینے (catch-up) کی نفسیات میں مبتلا رکھ سکتے ہیں۔ یہاں معاملہ ان تک پہنچنے کا نہیں بلکہ ان پر سبقت لے جانے کا ہے۔ اس عمل میں وہ ہرگز ہمارے معاون نہیں ہوسکتے، اس کے لیے تو ہمیں ازخود اقدامات کرنا ہوں گے۔

☆ ☆ ☆

سلسلۂ ادراک کی علمی اور تحقیقی کتابیں

پڑھیے پڑھایئے اور دین کا صحیح تصور عام کیجیے

ہم کیوں سیادت سے معزول ہوئے؟	قیمت: Rs. 80/-
اسلام میں تفسیر وتعبیر کا صحیح مقام	قیمت: Rs. 110/-
اسلام میں حدیث کا صحیح مقام	قیمت: Rs. 110/-
اسلام میں فقہ کا صحیح مقام	قیمت: Rs. 140/-
اسلام میں تصوف کا صحیح مقام	قیمت: Rs. 120/-
حقیقی اسلام کی بازیافت	قیمت: Rs. 200/-
کونوا ربانیین:	
اسلام کی آفاقی دعوت کا ایک چشم کشا تعارف	قیمت: Rs. 100/-
علم شرعی کی شرعی حیثیت	قیمت: Rs. 80/-

ادراک زوالِ امت (کامل دو جلدوں میں)	قیمت: Rs. 700/-
کتاب العروج (مصور، رنگین)	قیمت: Rs. 400/-
اسلام: مستقبل کی بازیافت	قیمت: Rs. 60/-
اسلام: مسلم ذہن کی تشکیلِ جدید	قیمت: Rs. 160/-
پردہ مگر کس حد تک؟	قیمت: Rs. 40/-
ہندوستانی مسلمان: ایامِ گم گشتہ کے پچاس برس	قیمت: Rs. 250/-
غلبۂ اسلام اور دوسری تحریریں	قیمت: Rs. 140/-
مسلم مسئلہ کی تفہیم	قیمت: Rs. 80/-

مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے ملاحظہ کیجیے:

www.RashidShaz.com

www.futureislam.com